مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

سعید احمد اکبرآبادی

(۱)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے میری پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب میں طالب علمی کی غرض سے دیوبند حاضر ہوا۔ لیکن مفتی صاحب کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلقات اور روابط میری پیدائش (۱۹۰۸ء سے بھی پہلے سے تھے) اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب اور ان کے پھوپھا حافظ سید عنایت حسین صاحب یہ دونوں سرکاری ملازمت میں ہونے کے ناطے آگرہ میں' مع متعلقین کے رہتے تھے اور والد صاحب قبلہ کے ان دونوں بزرگوں سے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کے اہل خانہ ہمارے گھر آتے اور میری والدہ ماجدہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر ان کے گھر جاتیں اور بعض مرتبہ دو دو تین تین دن قیام رہتا۔ اور ہاں یاد آیا، مفتی صاحب کے ایک اور پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق تھے وہ بھی آگرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ نہر تھے، والد صاحب کا ان سے بھی گہرا ربط و تعلق تھا، کم از کم ہفتہ میں ایک دن ملاقات ضرور ہوتی تھی جب والد صاحب اور یہ حضرات جمعہ کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں پڑھتے اور اس سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرہ میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر لطف صحبت و ملاقات اٹھاتے۔

ان رشتہ داریوں کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا

[illegible] سے آگرہ آنا جانا رہتا اور مفتی صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوتے، حضرت مفتی صاحب [illegible] بھی آگرہ آتے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے اور والد صاحب قبلہ آپ کی بڑی خاطر و مدارات کا اہتمام کرتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی بڑی [illegible] بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور میں ان کے اور چند خواتین کے ساتھ تاج محل دیکھنے گیا تھا [illegible] مرتبہ مفتی صاحب سے آگرہ کا ذکر آیا تو بولے: ابا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) (کا کشف قبور کا علم بہت بڑھا ہوا تھا) قیام آگرہ کے دنوں میں ایک روز بادشاہ اکبر کے مقبرہ سکندرہ تشریف لے گئے، تو قبر پر پہنچتے ہی آپ کی حالت متغیر ہو گئی اور طبیعت پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو گئی اور فرمایا: جلد چلو، عذاب الٰہی نازل ہو رہا ہے، اس کے برعکس تاج محل میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آپ آئے تو وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھی۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بھی سنایا: ایک مرتبہ ابا جی میرے ماموں حافظ عبدالحی صاحب کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لے گئے، گھومتے پھرتے جمنا کی طرف جو فصیل ہے اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے، اس وقت فضا بڑی دلکش اور سہانی تھی، موسم نہ گرم نہ سرد بڑا خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی اور سبک و خنک ہوائیں موجزن —— حافظ عبدالحی صاحب دراز قامت، گورے چٹے وجیہہ و مقبول صورت بزرگ تھے، سینہ چوڑا چکلا اور جسم ورزشی رکھتے تھے، عابد و زاہد اور نہایت متقی اور پرہیزگار اس درجہ کے تھے کہ کلکٹری میں سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی رشوت کا گھر میں آسکے، حافظ قرآن اعلیٰ درجہ کے تھے، قرآن سے ان کو عشق تھا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے، فن تجوید سے واقف تھے یا نہیں! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ان کی آواز میں اس درجہ درد اور لب و لہجہ میں اس غضب کا سوز و گداز تھا کہ سامعین پر ایک وجد اور سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا —— مفتی صاحب کا بیان ہے: تاج محل کی اسی [illegible] انگیز فضا میں بیٹھ کر ابا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ) نے حافظ عبدالحی صاحب

[illegible] کی فرمائش کی، وہاں تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا، باوضو تو وہ ہروقت [illegible] گردانی کرتے رہتے ہی تھے، فوراً سورۂ واقعہ شروع کر دی، سورت کے [illegible] کا وہ اسلوب اور آہنگ اور پھر حافظ صاحب کا وہ لحن داؤدی! اک سماں بندھ گیا۔ اباجی پر استغراق کا عالم دیر تک طاری رہا۔

حضرت مفتی صاحب کے علم کشف قبور کا ذکر ابھی آیا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سن لیجیے، ایک دن مفتی صاحب نے ذکر کیا: ایک مرتبہ اباجی مجھے ساتھ لے کر مدراس تشریف لے گئے جہاں آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ اس سفر میں ہم سرنگا پٹم بھی گئے، یہاں اباجی جب سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر پہنچے تو آپ بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب ہو کر ایصال ثواب کرتے رہے جب فارغ ہو کر اٹھے تو چہرہ پر بشاشت و انبساط کا عجیب عالم تھا اور فرمایا: اس مزار میں جو شخص دفن ہے، اللہ کے ہاں اسے شہادت کا بڑا اونچا مقام ملا ہے، رحمت باری کا نزول مسلسل ہو رہا ہے۔

بہرحال یہ تھی نوعیت ان تعلقات کی جو مفتی صاحب کے اور میرے خاندانوں میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے تھے۔

اب میرے ابتدائی حالات بھی سنیے تاکہ مجھ کو اکابر مشائخ و علمائے دیوبند کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے جو قرب و اختصاص رہا ہے اس کا پس منظر آپ کے سامنے آسکے۔

اگرچہ میرا ددھیال بچھرایوں ضلع مرادآباد اور ننھیال سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن والد ماجد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بسلسلہ ملازمت سرکاری پہلے اتر پردیش کے مختلف شہروں میں ادھر ادھر رہے، پھر آخر میں آگرہ پہنچے تو یہاں ایسا جمے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں دفن ہوئے، میری پیدائش آگرہ کی ہے اس لیے اکبرآبادی کہلاتا ہوں۔[1]

---

[1] میں پہلے نام کے ساتھ "اکبرآبادی" نہیں لکھتا تھا، لیکن کبھی بھولے بسرے سے لکھ دیا ہو اس کا اعتبار نہیں، چنانچہ میری تمام ابتدائی تصنیفات اور خود برہان کے ٹائیٹل پیج پر صرف

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

والد صاحب آگرہ کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے، ان سے ہماری تحقیقات کے [illegible]
کی آمدنی بھی بہت معقول رکھتے اور بڑی فراخی اور کشادہ دستی سے گذر بسر کرتے [illegible]
ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے رسم و رواج زمانہ کے مطابق انھیں [illegible]
تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے دوستوں [illegible]
سارے آگرہ میں نکو بنے، مسٹر اختر عادل آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ تھے اور بعد [illegible]
گورنمنٹ کے ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے، والد صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے [illegible]
کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیا سوجھی کہ لڑکے کو ملا بنا رہے ہیں، آپ اس کو انگریزی [illegible]
ذہین بچہ ہے، بڑا اچھا بیرسٹر ہوتا" ڈاکٹر تصدق حسین آگرہ کے بڑے نامور ڈاکٹر تھے [illegible]
انھوں نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ سعید کو انگریزی پڑھوا کر میڈیکل لائن [illegible]
بڑا ہونہار لڑکا ہے، بہت کامیاب ڈاکٹر ہوتا، عربی پڑھ کر اسے کیا ملے گا! بس ملا [illegible]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میرا نام درج ہے، لیکن [illegible]ء میں جب مولانا ابو الکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو میری کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے بارہ میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبر آبادی کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبر آبادی میرے نام کا جزو لاینفک ہو گیا، اس سلسلہ میں یہ ایک واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ [illegible] میں جب میں کناڈا سے نیویارک (امریکہ) گیا اور وہاں سے ایک دن کے لیے پرنسٹن یونیورسٹی بھی آیا تو جب میں یونیورسٹی کی لائبریری میں گھوم پھر رہا تھا اچانک لائبریرین میرے پاس آئے اور میری کتاب "فہم قرآن" کا جو نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ کیا اس کتاب کے مصنف آپ ہی ہیں؟ جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فوراً کتاب کی لوح پر میرے نام کے آگے اکبر آبادی کا لفظ بڑھا دیا تاکہ یہ [illegible] سے مستقل ہو۔

کرتا پھر منشی یا منشی فاضل کا امتحان دے کر [illegible] صاحب [illegible] تھا۔ والد صاحب
[illegible] بیگم صاحبہ سے [illegible] ہوئے، والد صاحب کا نام [illegible] تمہارے پاس کس
چیز کی ہے۔ سعید کو انگریزی کی تعلیم دلا کر مقابلے کے امتحان میں بٹھاتے، بڑا اچھا ڈپٹی
کلکٹر یا جج مقرر ہو جاتا۔ یہ دینی تعلیم کس کام آئے گی؟ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور فکر ہر کس
بقدر ہمت اوست۔ ایسے موقعوں پر والد صاحب کا عام جواب یہ ہوتا: اللہ کا حکم اور مشیت
یہی ہے۔ اس کی مشیت کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے
کہ آخر والد صاحب نے ایسی تعلیم کا فیصلہ کیوں کیا جس کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت نہیں
تھی اور جو مولانا شبلی کے لفظوں میں "آنچہ بجائے نیرزد بجہان" کا مصداق تھی!

ایک روز احباب خاص کی مجلس میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا:

"سعید میاں کی پیدائش سے پہلے میرے ایک لڑکی تھی، قمر النساء نام تھا۔ یہ بچی دس برس کی تھی کہ آگرہ میں طاعون پھیلا۔ خدا کی شان ہے اس مرض کے کتنے ہی بیمار میرے ہاتھوں اچھے ہو گئے تھے، لیکن خود میری اپنی بچی اس کا شکار ہو گئی، قمر کے بعد میرے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے اب کیا توقع ہو سکتی تھی، میرا جی دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور میں نے ہجرت کا پکا ارادہ کر لیا، لیکن اجازت طلبی کے لیے جب میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی عبدالغنی صاحب[1] منگلوری کو خط لکھا تو انہوں نے جواب میں ہجرت نہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لکھا

---

[1] بچپن میں متعدد بار خاکسار کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت فیض درجت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل منگلوری جو مشہور عالم اور بزرگ تھے ان کے فرزند ارجمند تھے، شروع میں لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن والد بزرگوار کی وفات کے بعد اچانک آپ میں انقلاب پیدا ہوا، ایک کوٹھری میں بند ہو کر چالیس دن کا چلہ کھینچا جس میں جو کی دو ٹکیوں کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتے تھے، مقررہ مدت کے بعد چلہ سے باہر آئے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

Jamia Nagar

تم گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ تم کو فرزند سعید عطا فرمائے گا۔ چنانچہ اس بشارت کے کئی برس بعد یہ بچہ پیدا ہوا، اس کے علاوہ ایک واقعہ ہوا کہ اس بچہ کی ولادت سے دو تین گھنٹے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں، میں نے انھیں دیکھا تو سروقد کھڑا ہو گیا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا: حضرت تشریف رکھیے، ادھر سے ارشاد ہوا: "ڈاکٹر! فرزند سعید مبارک ہو، ہم بیٹھیں گے نہیں، اسی مبارک باد کی غرض سے آئے تھے" بس یہ فرمایا اور رخصت ہو گئے"۔"

والد صاحب نے اس کے بعد فرمایا:

"پیر و مرشد کی بشارت اور پھر یہ خواب اور دونوں میں فرزند سعید کے الفاظ پر میں نے غور کیا تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ اشارۂ غیبی ہے اس امر کی طرف کہ میں بچہ کا نام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو اب عالم ہی دوسرا تھا، جذب اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ نگاہوں میں عجیب کشش تھی، ان کے کشف اور کرامتوں کا چرچا عام تھا۔ مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں سرکاری افسروں اور امراء و رؤسا کی تھی، حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی بھی آپ کے جاں نثار مرید تھے، زندگی شاہانہ تھی، سات مشکی گھوڑے میں نے خود ان کے اصطبل میں گنے ہیں، بدعات کے سخت دشمن تھے، اتباع سنت پر ہمیشہ زور دیتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: تو میری دعاؤں سے پیدا ہوا ہے، اپنے باپ اور ماں کی طرح تو بھی میرا مرید ہو جا۔ میں بزرگوں کی مجالس میں گستاخ ہمیشہ کا ہوں، فوراً عرض کیا: حضرت مجھ پر تو ابھی نماز بھی فرض نہیں ہے۔ والد صاحب اس گستاخی پر مجھے سرزنش کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت قاضی صاحب نے روک دیا اور ہنس کر فرمایا: شاباش! ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔

٭ ٭ ٭

جید کھوں اور دیوبند میں اسے عربی اور دینی تعلیم دلاؤں۔

جب والد صاحب قبلہ نے میری تعلیم کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا تو اب انھوں نے اس کا اہتمام بھی اس طرح کیا کہ کوئی اور لڑکا انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا، میری بسم اللہ کے لیے حضرت قاضی صاحب کو منگلور لکھا تو آپ نے اسی مقصد کے لیے اپنے ایک عزیز میاں محمد افضل کو بھیج دیا۔ یہ اگرچہ عالم نہیں تھے، لیکن نیم مجذوب تھے اور مشہور تھا کہ مادر زاد ولی اور مستجاب الدعوات ہیں، اس کے بعد ایک حافظ اور ایک مولوی صاحب کا تقرر کر دیا گیا، ان سے میں نے علی الترتیب قرآن مجید پڑھا اور اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اب عربی کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کو دیوبند لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی عربی تعلیم کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے، ازراہ کرم کسی اچھے عالم کا انتخاب کر کے بھیج دیجیے، تنخواہ معقول دوں گا، لیکن عالم کا متقی پرہیزگار ہونا ضروری ہے، کیونکہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ان کے سپرد ہوگی۔" دیوبند کے شیوخ میں سے ایک صاحب مولوی خورشید علی نام کے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور آج کل دارالافتاء میں کام کر رہے تھے، عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، گورے چٹے اور نورانی شکل و صورت کے انسان تھے، حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب سے بیعت تھے اس لیے اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں آگرہ بھیج دیا۔[۹]

---

۹ مولوی خورشید علی صاحب کے والد مولوی فرزند علی دیوبند کے وکیل یا مختار تھے، دارالعلوم دیوبند کا مکان جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رہتے تھے دراصل انھیں مولوی فرزند علی کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب مولوی خورشید علی اس کے مالک ہوئے تو باپ چونکہ قرض بہت کافی چھوڑ گئے تھے اس لیے مولوی خورشید علی صاحب نے یہ مکان دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ کیا تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مکان (واقع لوہا منڈی) کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لے کر رہتے تھے۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، ان کے متعلقین میں ایک بڑے ڈھلی بہن، ان کے علاوہ دو جوان لڑکیاں، رضیہ اور فاطمہ اور ایک جوان لڑکا حسن۔ اس طرح پانچ آدمیوں کا یہ کنبہ تھا جس میں وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ کا مصداق تھا، اس لیے پردہ کسی سے نہیں تھا، بے تکلف گھر میں آتا جاتا تھا۔

والد صاحب قبلہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ صرف فارسی اور عربی کی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اور اہم مضامین کی تعلیم بھی ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے میرے لیے ایک قابل ہندو گریجویٹ، مسٹر کٹ بہاری لال ماسٹر کا بھی تقرر کیا اور اب پروگرام یہ ہو گیا کہ صبح چار گھنٹے مولوی خورشید علی صاحب مجھ کو عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم دیں گے اور شام کو دو گھنٹے ماسٹر صاحب انگریزی، حساب اور تاریخ و جغرافیہ پڑھائیں گے۔ مولوی صاحب کے سپرد یہ کام بھی تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، مسجد میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جائیں گے اور صبح شام کی ہوا خوری میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی خورشید علی صاحب محبت اور توجہ سے پڑھاتے تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ان کو تصوف کا بڑا ذوق تھا، مثنوی مولانا روم کے عاشق تھے۔ اس لیے اکثر بزرگان اور اولیائے کرام کے قصے سناتے اور قرآن مجید کے احکام کی حکمتیں بیان کرتے رہتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دین کی عظمت اور بزرگان دین کی محبت بچپن ہی میں دل پر بیٹھ گئی اور اتالیق رکھنے سے دراصل والد صاحب کا مقصد بھی یہی تھا۔ میری عربی کی تعلیم کافیہ تک ہوئی تھی کہ مولوی خورشید علی صاحب چلے گئے اور ان کی جگہ رونیہ کے مولوی غلام نور صاحب آئے جو سرحدی اور نہایت قابل آدمی تھے، وہ ہمارے ہاں تو دو ہی ماہ رہے ہوں گے لیکن اس مدت میں مشق و تمرین کے ذریعہ انھوں نے صرف و نحو کے قواعد دماغ میں

[illegible] جس کا اثر میں اب تک محسوس کرتا ہوں اور چونکہ شق و تمرین کے لیے [illegible] صاحب مشالیں قرآن مجید سے لیتے تھے اس لیے ابتدا ہی سے قرآن مجید سے مناسبت [illegible] پیدا ہوگئی، علاوہ ازیں مجھ کو نحو ایسے خشک اور بے مزہ فن سے ایسی دلچسپی [illegible] کہ بعد میں کتاب سیبویہ اور النحو الوافی کا مطالعہ میں نے خود اپنے شوق سے کیا۔

کم و بیش چار برس تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کافیہ، قدوری وغیرہ تک پڑھ چکا تھا اس کے بعد والد صاحب نے میری انگریزی تعلیم موقوف کردی کیونکہ اب دونوں قسم کی تعلیم ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مقصد اصل عربی تعلیم کی تکمیل تھا۔ علاوہ ازیں اب والد صاحب نے مجھ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا، چنانچہ مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کر دیا گیا مراد آباد میں میرے اعزا و اقربا کافی تعداد میں تھے، لیکن والد صاحب نے کسی کے مکان پر میرے تنہا رہنے کو پسند نہیں فرمایا، ایک مکان کرایہ پر لیا اور دو نوکروں کے ساتھ میری والدہ اور ہمشیرہ خورد کو بھی میری خاطر مراد آباد بھیج دیا، مدرسۂ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری تھے اور مدرس مولوی محمد اسحاق صاحب کانپوری اور مولوی محمد حنیف صاحب امروہوی تھے، میری کتابیں شرح جامی، شرح وقایہ وغیرہا ان تینوں حضرات کے پاس تھیں، تعلیمی سال کے ختم پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری امدادیہ مدرسہ چھوڑ دارالعلوم دیوبند آگئے تو اب والد صاحب نے مجھ کو بھی دیوبند بھیجنے کا ارادہ فرما لیا، یہ غالباً ۱۹۲۱ء یا ۲۲ء کی بات ہے۔

لیکن والد صاحب نے جو اہتمام مراد آباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا، مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب مرحوم و مغفور آگرہ کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر دیوبند میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہاں محلہ شاہ ابو المعالی میں ان کا ایک ذاتی مکان تھا اسی میں رہتے تھے، اسی مکان کی بغل میں حافظ صاحب کا ایک اور مکان تھا، والد صاحب نے یہ مکان جس کا اصل دروازہ بھی پہلے مکان کے اندر ہی تھا حافظ صاحب سے کرایہ پر

لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دو نوکروں کے اس گھر میں منتقل کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آ گئے۔ میں نے اگر شروع میں کہا ہے کہ والد صاحب قبلہ نے میری عربی تعلیم کا اہتمام اتنا کیا کہ کوئی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا تو یہ کچھ کیا غلط کہا۔ والد صاحب کی پریکٹس کی آمدنی کا اوسط اگر کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی مان لیا جائے تو چھ مہینے کی رخصت کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے چھ ہزار کا نقصان کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے والد صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرنے، والد صاحب نے جواب دیا: حضرت! بچہ بہت لاڈ اور پیار کا پالا ہوا ہے، کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں ہے اس لیے مہربانی فرما کر صرف ایک برس کی اجازت دے دیجیے، بات رفت گذشت ہوئی، دارالعلوم میں میرا داخلہ ہو گیا، اور میں پورے گھر کے ساتھ محلہ شاہ ابو المعالی میں رہنے لگا۔

مفتی صاحب کے اور میرے تعلق کی داستان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر عصر کی نماز کے بعد اپنی بہنوئی یعنی حافظ عبدالحی صاحب مرحوم کے گھر تشریف لاتے تھے اور مفتی صاحب کے فرزند اکبر آپ کے ہمراہ ہوتے، ہمارا مکان بغل میں تو تھا ہی، وہاں سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب ہمارے گھر آتے اور کچھ دیر والد صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ والد صاحب سخت بیمار ہو گئے اور علالت کا سلسلہ طویل ہو گیا جس کے باعث ہم سب لوگ سخت پریشان تھے، اس زمانہ میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پابندی سے ہمارے گھر آتے اور والد صاحب پر کچھ پڑھ پڑھ کے دم کرتے رہتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص اور ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس روز والد صاحب کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور ہم لوگ سخت پریشان اور فکر مند تھے کہ اگر رخصت کے ختم ہونے تک والد صاحب شفایاب نہ ہوئے تو ان کی سرکاری ملازمت کا کیا ہوگا،

ایک ہفتہ بعد اچانک خود بخود ایسے صحت یاب ہوئے کہ گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

مجھ میں اور مفتی صاحب میں فاصلہ بہت کافی تھا کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے سات برس بڑے تھے، میں متوسطات کا طالب علم اور وہ معین المدرسین۔

اس قدرتی فاصلہ کے باعث شروع شروع میں میرے اور ان کے درمیان یک گونہ حجاب حائل رہا لیکن مفتی صاحب کی روزانہ آمد و رفت اور غیر معمولی توجہ اور کرم نے مجھ کو جلد بے تکلف بنا دیا۔

اسلام کا نظام حکومت

جدید ایڈیشن

مؤلف مولانا حامد الانصاری غازی

اس کتاب میں اسلام کی ریاستِ عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان تالیف اسلام کا نظام حکومت ہی نہیں پیش کرتی بلکہ نظریۂ سیاست و سلطنت کو بھی منظر عام پر لاتی ہے۔ طرز تحریر زمانۂ حال کے تقاضوں کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے۔

صدیوں سے جو غلط نظریے اسلام کی طرف منسوب ہو گئے ہیں ان کی تردید کے لیے ایک خاص اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ہمارے لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جو قانون قرآن، قانون نبوت، دستور صحابہ کے علاوہ اسلام کے علمائے اجتماعیات کی بے شمار کتابوں اور عصر حاضر کے نوشتوں کے مطالعہ اور سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد سامنے آئی ہے۔

صفحات ۴۹۶ بڑی تقطیع ۔ قیمت مجلد عمدہ ریگزین -/35 روپے